ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری

زیرِ تربیت مسیحی مبشّرین سے خطاب

[ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری بنارس (ہندوستان) کے ایک معروف عالمِ دین ہیں۔ اُنہیں بنارس کے ایک مسیحی تعلیمی و تربیتی ادارے کے طلبہ سے خطاب کرنے کا موقع ملا جسمیں مسیحی ادارہ ہندوستان میں ترویجِ مسیحیت کے لیے تیار کر رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر خود قلمبند کی جو ماہنامہ "محدّث" (بنارس) میں مناسب تمہید کے ساتھ شائع ہوئی۔ اسے ہم تمہیدی حصّہ حذف کرتے ہوئے ہفت روزہ "الاعتصام" (لاہور) کے شکریے سے پیش کر رہے ہیں۔ مدیر]

آپ کا مقصد اپنے مذہب (نصرانیت) کو سیکھنا اور دوسروں کو سکھانا ہے، اس کام کے لیے آپ نے خود کو وقف کیا ہے، آج کے مادی دَور میں مذہب و اخلاق کے لیے یکسو ہونا اپنی جگہ بڑی بات ہے۔ اگر آپ کے پیشِ نظر انسانی معاشرہ کی اصلاح و بہبود ہے تو یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اصلاح کا کام مشکل اور محنت طلب ہے۔ ایک نیک نیّت و مخلص مصلح کو قربانی دینا پڑتی ہے۔ پھر بھی نتائج حسبِ منشاء ظاہر نہیں ہوتے۔

پانی میں ہے آگ کا لگانا دشوار
بہتے دریا کو پھیر لانا دشوار
دشوار تو ہے مگر نہ اتنا جتنا
بگڑی ہوئی قوم کا بنانا دشوار

آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس دَور میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا موجود ہے جو مذہب کے ذریعہ کسی نوعیت کی اصلاح کا قائل نہیں۔ اُس کا خیال ہے کہ مذہبی اقدار و تعلیمات کا دور ختم ہو گیا۔ اب انسانی افکار و نظریات ہی کے ذریعے معاشرے کی ضرورتیں پوری ہوں گی۔ ایسے لوگوں کے سامنے آپ کو مذہبی و اخلاقی تعلیمات و اقدار کی برتری ثابت کرنا ہو گی اور مذہب کے ذریعہ اصلاح کے ایسے نمونے پیش کرنے ہوں گے جن سے منکرینِ مذاہب آپ کے قائل ہو جائیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ الحاد و بے دینی کے رجحان کو مغرب کی مسیحی دنیا ہی نے سہارا دیا ہے اور آج یہ رجحان تمام مذہب

پرست طبقوں کے لیے باعثِ تشویش ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام کا برحق اعلان یہ ہے کہ انسانی معاشرہ کی تمام دشواریوں کا حل اور جملہ مصیبتوں کا خاتمہ اسی دینِ حنیف کے ذریعہ ہو سکتا ہے جو زمین پر ہدایاتِ ربانی اور تعلیماتِ الٰہی کا محافظ و امین ہے۔

نصرانیت کی تعلیم و تبلیغ کے میدان میں آپ نے قدم رکھا ہے، تو آپ کو پہلے یہ سوچنا ہوگا کہ ہمارے سماج کو آپ کی خدمت و اصلاح کی ضرورت ہے؟ اس کے جواب کے لیے موجودہ معاشرے پر نظر ڈالنا مفید ہوگا۔ آج ہر طرف بدامنی، بے چینی، فتنہ و فساد، قتل و غارت گری، فحاشی و بداخلاقی اور دوسری خرابیوں کا دور دورہ ہے۔ اخلاقی و مذہبی قدروں کو پامال کرنے کے بعد بھی انسان کو سکون نہیں۔ حرص و طمع کے غلبہ کا یہ حال ہے کہ ادنیٰ فائدہ کے لیے خونریزی ہو جاتی ہے۔ جذبات سے مغلوبیت کا یہ عالم ہے کہ انسان خون کے رشتوں کی پروا کیے بغیر ظلم و تعدی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جو جرائم پریس اور انتظامیہ کے علم میں آجاتے ہیں، ان ہی سے دماغ ماؤف ہو جاتا ہے، اور جن جرائم پر پردہ پڑا رہ جاتا ہے، ان کا ذکر ہی کیا۔ جب سماج کی صورتِ حال ایسی ہے تو ہر صاحبِ عقل و ہوش انسان یہ تسلیم کرے گا کہ ہمارے دور کو اصلاحی خدمات کی سخت ضرورت ہے۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ سماج کو ہماری خدمت کی ضرورت ہے تو اب اس پہلو پر غور کرنا چاہیے کہ سماج کو کس نوعیت کی خدمت کی ضرورت ہے؟ کیا مذہبی و اخلاقی اقدار کو پرائیویٹ زندگی تک محدود کر دینے سے سماج کی اصلاح کا مقصد حاصل ہو جائے گا؟ کیا آزادی و مساوات کے نام پر فحاشی و بے راہ روی کی راہ ہموار کر دینے سے ہمارا سماج ترقی یافتہ ہو جائے گا؟

اگر سنجیدگی سے ان سوالات پر غور کیا جائے گا تو ہمیں خدمت و اصلاح کے لیے اپنی راہ متعین کرنے میں آسانی ہوگی۔ انسان کی معاشرتی تاریخ گواہ ہے کہ جب تک انسان اپنے پیدا کرنے والے کو نہ پہچانے گا، اس کے بتائے ہوئے راستہ پر نہیں چلے گا اور انسانیت کی قدر و منزلت کو دل سے تسلیم نہیں کرے گا، اس وقت تک وہ فلاح و بہبود سے ہمکنار نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت سے رو گردانی اور انسانی اقدار کی پامالی کا جو رجحان اس وقت ہمارے معاشرہ میں موجود ہے، یہی ہماری ناکامیوں اور پریشانیوں کا اصل سبب ہے۔ زندگی کے سدھار کے لیے آخرت پر یقین بھی ضروری ہے۔ اگر ہمارے اندر یہ یقین بیدار نہ ہوگا تو ہمارے کردار میں کبھی استواری نہیں آسکتی۔

خدمت کی نوعیت متعین کرنے کے بعد ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ سماج کو ہم سے کیا توقعات ہیں؟ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ خدمت و اصلاح کا کام مشکل ہے، اس سلسلہ میں مایوسی و محرومی کے احساس سے بچنے کے لیے ہم کو یہ سوچنا ضروری ہے کہ خدمت و اصلاح کے جس کام کو ہم انجام دے

رہے ہیں، اس میں خود ہمارا فائدہ ہے، چونکہ یہ ہمارے معاشرے کی ضرورت ہے، اس لیے ہماری بھی ضرورت ہے اور اس ضرورت کی تکمیل کے لیے قربانی پیش کرنا ہماری سعادت ہے۔

سماج کو ہم سے جو توقعات ہیں، ان کی فہرست طویل ہے۔ لیکن سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہماری زندگی مثالی ہو۔ یعنی جن خوبیوں کی ہم دوسروں کو تلقین کرتے ہیں، ان کا ہماری زندگی پر اثر نمایاں ہو۔ اسلام نے اس بات کو اللہ تعالیٰ کی سخت ناراضگی کا سبب قرار دیا ہے کہ انسان دوسروں کو جن بھلی باتوں کا حکم دے، خود ان پر عمل نہ کرے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دوسروں کے لیے ہمارے اندر خیر اندیشی اور ایثار و قربانی کا جذبہ موجود ہو۔ اگر ہم اپنی منفعت کو مقدم رکھیں اور دوسروں کے دکھ درد کو نہ سمجھیں تو پھر ہمارے دعوتی خدمت کا کوئی وزن نہ ہوگا۔

تیسری بات یہ ہے کہ ہمارا عمل ہمارے اس یقین کا مظہر ہو کہ زندگی کا سدھار مذہبی و اخلاقی اقدار کی پیروی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس حقیقت سے جس طرح ہم کو باخبر ہونا ضروری ہے، اسی طرح دوسروں کو بھی اس سے آگاہ کرنا ہماری بنیادی ضرورت ہے۔

تقریر کا آخری جزو چند قرآنی آیات کے ترجمہ پر مشتمل تھا۔ سب سے پہلے میں نے سورہ الحدید کی آیت نمبر ۲۷ کا یہ ترجمہ پیش کیا۔

> اور پھر ہم نے ان رسولوں کے پیچھے اور رسول بھیجے۔ اور ان کے بعد عیسیٰ بن مریم کو رسول بنا کر بھیجا اور ہم نے اسے انجیل دی اور جو لوگ اس کے پیرو ہوئے تھے، ان کے دلوں میں ہم نے رحم اور نرمی پیدا کی تھی اور انھوں نے رہبانیت اختیار کر لی جس کا ہم نے ان کو حکم نہ دیا تھا، مگر انھوں نے اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے اسے اختیار کیا۔ پھر انھوں نے اس کے لائق اس کی رعایت ملحوظ نہ رکھی۔ پس ان میں جو اصل ایمان پر مضبوط رہے تھے ان کو ہم نے ان کا پورا بدلہ دیا اور بہت سے ان میں نافرمان تھے۔

اس کے بعد سورہ الزخرف کی آیت ۶۳-۶۴ کا ترجمہ پیش کیا۔

> اور جب عیسیٰ علیہ السلام کھلے احکام لائے تو انھوں نے کہا میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور اس لیے کہ بعض باتیں جن میں تم لوگ باہمی اختلاف رکھتے ہو، وہ تم لوگوں کو پوری طرح سمجھاؤں۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ بے شک اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے، پس تم اس کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔

پھر سورہ الشوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ کا ترجمہ سنایا۔

تمہارے لیے دین مقرر کیا ہے جس کی بابت نوح کو ہدایت کی تھی اور جو بذریعہ وحی تمہاری طرف حکم بھیجا ہے۔ اور جس کی ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو ہدایت کی تھی یہ کہ دینِ الٰہی کو قائم رکھو اور اس میں متفرق نہ ہو، جس مطلب کی طرف تم لوگوں کو بلاتے ہو وہ ان مشرکین پر ناگوار ہے۔ اللہ جس کو چاہے گا اپنی طرف کھینچ لے گا اور جو اس کی طرف جھکیں گے ان کو اپنی طرف راستہ دکھائے گا۔

اخیر میں سورہ المائدہ کی آیت ۶۶ کا ترجمہ پیش کیا۔

اور اگر وہ توریت اور انجیل پر اور جو کلام اللہ کے پاس سے ان کی طرف اُترا ہے، اس پر عمل کرتے تو البتہ اُوپر سے نیچے سے کھاتے، بعض ان میں سے متوسط چال ہیں اور اکثر ان میں سے بُرے کام کرتے ہیں۔

سوال و جواب کے وقفہ میں میں نے یہ وضاحت کی کہ اسلام نے آخرت میں جزاء و سزا کا جو عقیدہ بیان کیا ہے اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ آخرت کی امید پر دنیا میں جرائم اور ظلم و فساد کو برداشت کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اور سماجی خرابیوں پر خاموش رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اسلام نے دنیا میں فکر و عمل کی تمام خرابیوں کی اصلاح کے لیے ایک مکمل نظام قائم کیا ہے۔ ظلم و جرائم کے خلاف اس نے طاقت کے استعمال کی تلقین کی ہے۔ فرد، معاشرہ اور حکومت ہر ایک کے لیے اس نے ایسے تاکیدی احکام دیے ہیں جن سے برائی کرنے والوں کی تنبیہ و تعزیر کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ اس نے برائی اور جرائم کے خلاف حکومت اور افراد کو طاقت استعمال کرنے کا حکم دیا ہے، اسی لیے حدود، قصاص اور تعزیر کا نظام قائم کیا گیا ہے، پھر اس نے محکمۂ احتساب کے قیام کی حمایت کی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ بااختیار حضرات عوام کی نگرانی کریں، اور ان کو غلط کاریوں سے باز رکھیں اور جو لوگ چوری چھپے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، ان کی کیفرِ کردار تک پہنچائیں، لیکن ان تمام تدابیر کے باوجود بھی ایسے دن کی ضرورت ہے جس میں مکمل طور پر پورے انصاف کے ساتھ ہر شخص کو اس کے اچھے برے، ظاہر و خفیہ تمام کاموں کا بدلہ دیا جائے اور نیک لوگوں کی تکریم کی جائے۔ دنیا میں جرائم کی سزا سے آخرت کی ضرورت ختم نہیں ہوتی۔ دنیا میں نیکی کرنے والوں کو ان کا بدلہ کہاں ملتا ہے؟ اسی طرح بڑے بڑے پیشہ ور اور بااقتدار مجرم بھی ہمیشہ قانون کی گرفت سے باہر رہتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے توحید و رسالت کے احکام کی اہمیت بہت زیادہ ہے؟

آج کے دور میں کہیں اسلام کی بات آئے تو بنیاد پرستی و دہشت گردی کا ذکر لازمی آجاتا ہے۔ مذکورہ مجلس میں بھی میرے سامنے ایک سوال آیا کہ بنیاد پرستی کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟ اور

قرآن میں کہیں سخت گیری اور قتل و قصاص کی تعلیم ہے؟ تو کیا اس سے دہشت گردی کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی؟

میں نے جواباً عرض کیا کہ دنیا میں جدید اصطلاحات کو جو لوگ رواج دیتے ہیں اور ان سے ایک مخصوص نوعیت کا محمود یا مذموم مفہوم مراد لیتے ہیں، ان کے پیچھے پڑھے لکھے باہوش لوگوں کو بے سوچے سمجھے چلنا نہیں چاہیے۔ جو چیز ہمارے سامنے آئے، اسے علم و عقل، مذہب و دانش اور تہذیب و تمدن کے اصولوں کی روشنی میں اور انہی کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ اسلام نے جب اعلان کیا کہ اس کے پانچ ارکان یعنی کلمۂ شہادت، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ یہی چیزیں اسلام کی بنیاد اور اس کے ارکان ہیں تو اس لحاظ سے پیغمبر اسلام ﷺ بلکہ آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک تمام مسلمان بلکہ آسمانی ادیان کو صحیح طور پر ماننے والے تمام لوگ بنیاد پرست قرار پائیں گے، کیونکہ وہ مذہب کی بنیادی تعلیمات کے پابند تھے اور پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہی بنیاد پرست مسلمان اپنے عہد عروج میں (ساتویں صدی عیسوی سے بارہویں اور تیرہویں صدی تک) دنیا بھر کے اور خاص طور پر اہلِ مغرب کے معلم و پیشرو تھے۔ لہذا اس مفہوم کے لحاظ سے تمام مسلمان بنیاد پرست ہیں اور ہمیں اس لقب پر فخر ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر مذہب کے ماننے والے بنیاد پرست بن جائیں، تاکہ مذہب کے نام پر تجارت، حصولِ ملک و اقتدار اور تسکین حرص و ہوس کا سلسلہ ختم ہو، لیکن اگر بنیاد پرستی کی اصطلاح سے کوئی اور مفہوم لیا جا رہا ہے تو اس کی تشریح و تعیین ہونا چاہیے تاکہ دیکھا جا سکے کہ دین و لغت کے اعتبار سے یہ مفہوم صحیح ہے یا نہیں؟ نیز اس کا مصداق طبقاتی نظام کی حوصلہ افزائی، عورتوں کو زندہ جلانا، شراب و خنزیر کا استعمال اور سُودی نظام کے ذریعہ مفلوک الحال انسان کا استحصال بھی کسی بنیاد پرستی کے ضمن میں آتا ہے یا نہیں؟

اس کے بعد تشدّد و دہشت گردی کی بات آئی۔ اس سلسلہ میں، میں نے عرض کیا کہ یہ الزام پرانا ہے کہ "اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔" اس کا جواب بہت سی کتابوں اور مضامین میں دیا گیا ہے۔ ان کو آپ پڑھ سکتے ہیں، البتہ تشدّد و دہشت گردی کے موضوع پر موجودہ حالات کی روشنی میں کچھ عرض کرنا مناسب ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ اسلام کی تمام لڑائیاں دفاعی نوعیت کی تھیں، اسلام نے اقدامی جنگیں بھی لڑی ہیں۔ اگر اسلام کی دعوتِ توحید و رسالت، عدل و انصاف اور تقویٰ شعاری و کردار سازی کو روکنے کی کوشش کی جائے گی، تو اس رکاوٹ کو ختم کرنے کے لیے وہ تلوار اٹھا سکتا ہے اور جو لوگ اس رکاوٹ کی سربراہی کریں گے، ان کا سر قلم کر سکتا ہے، کیونکہ کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، اگر اس کائنات میں اس کی توحید و رسالت کا کلمہ سربلند نہ ہوگا، تو پھر اس کا کوئی وزن بھی نہ ہوگا، ایسی کائنات اور اس میں بسنے والے انسان کسی بھی احترام و توقیر کے مستحق نہ ہوں گے۔ رہا اسلام کی دفاعی لڑائیوں کا مسئلہ تو اس کی تفصیل آپ کتابوں میں پڑھیں گے۔

اس وقت جن اعمال کو اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ مسلمانوں کے اعمال ہیں، اسلام نے ان کا حکم نہیں دیا ہے۔ لہذا اسلام کی بجائے ان افراد و جماعت سے دریافت کرنا چاہیے جو ان اعمال کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اگر اسلام کے سلسلہ میں کسی طرح کا شبہ ہو تو قرآن و حدیث کی تعلیمات کا مطالعہ کر کے ان آیات و احادیث کی نشاندہی کی جائے جن سے تشدّد و دہشت گردی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ یہاں وکالت کے طور پر نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت کے لیے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ جدید دور میں مغربی و مشرقی سامراج نے جس طرح مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ہے، اس کے پیشِ نظر تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ اس احساسِ محرومی پیدا ہوا ہے جس کا اظہار تشدّد کے افعال سے ہوتا ہے، لہذا اس کا سبب اسلام میں ڈھونڈنے کی بجائے مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و ستم میں تلاش کرنا چاہیے۔

جو لوگ تشدّد و دہشت گردی کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں، ان سے الزامی طور پر ہم یہ بھی کہیں گے کہ دیگر مذاہب، تہذیبوں اور نظاموں کی تعلیمات اور تاریخ کی روشنی میں اسلامی تعلیمات اور تاریخ کا مطالعہ کیجیے۔ پھر تقابل کر کے دیکھیے کہ تشدّد کے واقعات اسلام میں زیادہ ہیں یا دیگر مذاہب میں؟ اگر ایسے واقعات اسلام میں زیادہ ہوں گے تو ہمیں توجیہ و معذرت کی ضرورت ہوگی، ورنہ دوسرے مذاہب والوں کو اپنا بیان پیش کرنا ہوگا۔

اس کے بعد جدید تہذیب و تمدّن اور اس کے زیرِ سایہ رونما ہونے والے واقعات پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ فرانسیسی انقلاب (۱۷۸۹ء) کو جمہوریت اور مساوات و آزادی کا نقطہ آغاز قرار دیا جاتا ہے، لیکن اسی فرانس کے سامراجی نظام سے آزادی حاصل کرنے کے لیے الجزائر کے مسلم عوام کو دس لاکھ انسانی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑا تھا۔ اور آزادی کی نعمت سے ہمکنار ہونے کے بعد آج بھی اس ملک کے عوام کو اپنی مرضی کی حکومت تشکیل دینے کا موقع نہیں دیا جا رہا ہے۔

برطانوی سامراج کا جو کردار خود ہمارے ملک ہندوستان میں رہا ہے، اس سے سب واقف ہیں۔ تقریباً دو صدیوں کو محیط اس تاریخ میں ظلم و جور اور تشدّد و بربریت کی وہ کون سی شکل ہے جو موجود نہ ہو، آزادی کے جس حق کی آج اہلِ مغرب حمایت کرتے ہیں، اپنے وطن میں اسی مطالبہ پر ہندوستانی عوام کو جن صبر آزما حالات سے گزرنا پڑا، اس کو پڑھ اور سن کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سامراج کے اس ظلم و تشدد کا نشانہ وہ مسلمان بھی تھے جنہیں آج دہشت گردی کا طعنہ دیا جا رہا ہے، بلکہ انہی مسلمانوں کے ذریعہ جنگ آزادی کا آغاز ہوا تھا۔ حکومت کی کرسیوں پر بیٹھ کر شاہی تمکنت کا اظہار کرنے والے حضرات آج نہیں جانتے ہوں گے کہ سیّد احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید اور علمائے صادق پور کون تھے، لیکن ان کی داستانِ شجاعت و حق پرستی سرزمین وطن کے ہر حصّے بلکہ یہاں کی فضا کے غیر مرئی صفحات پر اس طرح رقم ہے کہ آنے والا مؤرخ اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ اگر اس زرّیں تاریخ کو نظر انداز کر کے آج ہم مسلمانوں پر تشدّد کا الزام عائد کریں گے تو ہم اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا؟

امریکہ نے ویٹنام میں، روس نے افغانستان میں، اور موجودہ دور کے اتحادیوں نے عراق میں جو کارگزاری پیش کی ہے اور پورے مغرب و اقوام متحدہ نے بوسنیائی مسلمانوں کے ساتھ جو منفی رویّہ اختیار کیا ہے، کیا اس کی کوئی توجیہ کی جا سکتی ہے؟

علامہ اقبال برصغیر کی آزادی سے پہلے فوت ہو چکے تھے، مغرب کے مدعیانِ تہذیب و تمدّن اور حامیانِ عدل و مساوات کی انسانیت دشمنی کے بہت سے مظاہر اس وقت تک پردہ خفا میں تھے۔ پھر بھی موصوف نے "ضربِ کلیم" میں "مسولینی" کے عنوان سے اپنی نظم میں مغرب کے فلسفۂ انسانیت دوستی کی قلعی کھول دی ہے اور مسولینی کی زبان سے ان حقائق کا اظہار کرا دیا ہے جنہیں آج برملا طور پر ہم دیکھ رہے ہیں۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج؟
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں، تم نے لوٹے تخت و تاج
پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج

مذکورہ تمام باتوں کو مدّ نظر رکھ کر ہم کو سوچنا ہوگا کہ اسلام اور مسلمانوں پر دہشت گردی و تشدّد کا جو الزام لگایا جا رہا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے؟ میں اپنی بات یہیں ختم کرتا ہوں اور آپ لوگوں سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ نصرانیّت کے ساتھ ساتھ آپ اسلام اور اسی طرح دوسرے مذاہب کا بھی مطالعہ کریں گے اور مطالعہ کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ شکریہ۔